خودی اور ثقافت

(تجزیہ)

احمد رضا خان

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

وہ بنیادی خیالات ' جو حضرت علامہ نے تصور 'خودی' کی توضیح کے لیے "الٰہیات اسلامیہ" کے چوتھے خطبے بعنوان "خودی ' جبر و قدر اور حیات بعدالموت" میں پیش کیے ہیں ان کی معنویت ' تصور ثقافت کے ساتھ نظری و عملی تعامل کی بنا پر قائم ہوتی ہے ۔ 'خودی' کا تصور ' اس وقت اپنی معنویت و اہمیت کھو دیتا ہے ' جب وہ انسانی ثقافت کے سیاق و سباق سے ہٹ کر سمجھا اور بیان کیا جاتا ہے ۔ فرد کی 'خودی' کا حقیقی امتحان اور قدر ' ثقافت ہی قائم کرتی ہے ۔ اس نکتے کو خود اقبال نے "رموز بیخودی" (۱۹۱۸ء) میں واشگاف انداز میں بیان کیا ہے ۔ مزید برآں 'خودی' کے حقیقی اور عینی مقاصد کے تعین اور حصول میں بھی ثقافت ایک انتہائی اہم محرک اور مہیج کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے ۔ تاہم 'خودی' اور ثقافت ' دونوں کا باہمی تعامل ' اثرات اور معنویت' توحیدی نظریہ حیات کے آفاقی معدن (Resource) سے پیوستہ ہے ۔

حضرت علامہ اقبال کا تصور 'خودی' ان کے فلسفیانہ نظام کا بنیادی تصور ہے جس کے خدوخال انہوں نے اپنی نظم و نثر دونوں میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ واضح کئے ہیں ۔ 'اسرار خودی ' (۱۹۱۵ء) 'رموز بیخودی' (۱۹۱۸ء) اور بعدازاں "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ "(۱۹۳۴ء) ' میں خود حضرت علامہ نے تصور خودی ' کو الٰہیات اسلامیہ اور اسلامی و انسانی تاریخ و ثقافت کی مختلف النوع جہات کی تعبیر و تفہیم کے لیے بڑے وسیع فکری و علمی تناظر میں استعمال کیا ہے ۔ تصور خودی ' اگرچہ ہماری روایتی ادبیات میں بطور ایک منفی مخصوص کیفیت کے ابلاغ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے 'تاہم ' علامہ اقبال وہ پہلے مسلمان مفکر شاعر ہیں ' جنہوں نے اس تصور کو ایک متحرک متخیل اور تخلیقی علمی تصور کے طور پر تشکیل دیا ہے ' چنانچہ اس کے اطلاق سے ہم نہ صرف جنوبی ایشیا کے مسلم تمدن بلکہ عالم اسلام کی تاریخی ' نفسیاتی ' علمی اور ثقافتی قدر کی ایک واضح اور مضبوط نظری و بصری تصویر بنا سکتے ہیں ۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ ایک آفاقی شعوری وحدت کا انسانی حیات کی سطح پر کوئی عالمگیر ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے تو کچھ بیجا نہ ہو گا ۔ 'خودی' کا لفظ جتنا سادہ اور عام فہم سا ہے ' اپنے اعلیٰ ترین نفسی ---- شعوری پہلو میں بڑا دقیق اور کثیر المعانی ہے ' چنانچہ پروفیسر محمد عثمان اپنے تنقیدی مطالعے "اسرار و رموز پر ایک نظر" (۱۹۷۷ء) میں لکھتے ہیں کہ " انسانی فکر کے دوسرے اعلیٰ اور نازک تصورات کی طرح

خودی کی تعریف کرنا بھی مشکل ہے ۔ آج نفسیات کی اصطلاح میں شخصیت کا جو مفہوم ہے ' خودی اس کے بہت قریب ہے" ۲ پروفیسر موصوف کے اس خیال میں بہت حد تک طاقت ہے کیونکہ اقبال نے خود ' تصور 'خودی' کو بہت تخلیقی لچک کے ساتھ استعمال کیا ہے ' اور کرنا بھی چاہیے تھا کہ عبقری اسی طرح کیا کرتے ہیں ' کیونکہ انہیں اظہار حقیقت کی شدت ' توضیحات و ترجیحات کے مغالطے میں مبتلا نہیں ہونے دیتی بلکہ ان کا تفکر ' الفاظ و تصورات کو نئی حیات علمی دیتا ہے ' بلکہ اگر کہا جائے 'وجود معنوی' عطا کرتا ہے ' تو زیادہ موزوں ہو گا ۔ بقول فلسفی شاعر:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

تاہم پروفیسر عثمان اپنے محولہ بالا تنقیدی مطالعے میں چند سطریں آگے چل کر 'خودی' کے بارے میں بڑے سلیس ' واضح اور عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں کہ " اقبال اس لفظ یا اصطلاح (خودی) سے جو کچھ سمجھتے اور سمجھانا چاہتے تھے اسے آسان لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے : کہ قدرت (خدا تعالیٰ) ہر شخص کے اندر جسم و ذہن اور قلب و نظر کی کچھ صلاحیتیں ' استعدادیں اور قابلیتیں ودیعت کرتی ہے ۔ یہ صلاحیتیں ہمارے اندر سوئی ہوئی ' چھپی ہوئی ' ناپختہ اور خام ہوتی ہیں اور ابتداء" ہم ان سے ناآشنا اور ناواقف محض ہوتے ہیں ۔ قدرت (خدا تعالیٰ) کا منشاء یہ ہے کہ ہم اپنی ان صلاحیتوں کی تلاش پردہ اخفا سے معرض شہود میں لائیں ۔ اور اس طرح ان کی (گویا اپنی) ترقی و ارتقاء کا سامان پیدا کریں ۔ یہ صلاحیتیں اور استعدادیں جو کروڑوں اربوں انسانوں میں بھی کسی دو میں ایک جیسی نہیں ہوتیں ۔ انہی کی مجموعی ترکیب سے ہر شخص کی ذات ' انا' یا خودی تشکیل پاتی ہے اور اپنی جگہ پر لاثانی و منفرد ہوتی ہے ۔ جس شخص کی صلاحیتیں غیر ترقی یافتہ اور غیر ارتقاء پذیر رہ گئیں اس کی خودی گویا خوابیدہ و خام ہے اور جس نے ان صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کے نشو و ارتقاء کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالی اس نے خودی اور اس اعتبار سے زندگی کا راز پا لیا ۔ اور وہ اس قوت و شوکت کا اہل بن گیا' جو نسل آدم کا اصلا" حق ہے ۳ ۔ علامہ اقبال کی نثر و نظم کے مطالعے کے دوران ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ 'خودی' کا تصور ان کے نظام فکر و شعور میں ایک حرکی حقیقت کے طور پر دوڑ رہا ہے اور جس کی طاقت سے وہ اپنی فکر کے تار و پو مختلف ابعاد میں پھیلاتے ہیں ۔ انسان ' مسلمان ' تاریخ ' ثقافت ' زمان ' مکان ' کائنات اور خدا کے بارے میں ان کا نفسی اور فکری ' رویہ ' اسی تصور (خودی) کی بدولت نمو پاتا ہے ' اسلامی ثقافت و تاریخ کی تعبیر و تشریح کے لیے بھی اقبال اسی تصور کی مدد سے دقیق سے دقیق مسئلے پر انتہائی چابکدستی سے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس طرح' خودی ' ان کے نظام فکر میں بنیادی علمی اکائی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ۔ اب 'خودی' کے جس " اخفاء یا خلوت کے پہلو " ۴ کا اقبال بارہا ذکر کرتے ہیں ' اور جس کی کھوج 'نمو اور حفاظت کے لیے وہ فرد پر بڑا کڑا زور دیتے ہیں ' کا اصل معیار اور قدر ثقافت ہی متعین کرتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

خودی اور ثقافت

"خودی کی زندگی اطناب کی ایک حالت ہے جس کو اس نے اپنے ماحول (فطرت، تاریخ، ثقافت وغیرہ) پر اثر آفرینی اور اثر پذیری کی خاطر پیدا کر رکھا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہو گا کہ اثر آفرینی اور اثر پذیری کی اس کشمکش میں خودی کا وجود اس (تاریخ و ثقافت و فطرت کی واردات) سے باہر رہتا ہے، ہرگز نہیں، برعکس اس کے وہ ایک رہنما توانائی کی طرح اس میں شامل رہے گی"۔

ہم سمجھتے ہیں کہ 'خودی' کی نفسی۔ وجودی ساخت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ اپنے ماحول، فطرت اور ثقافت کے ساتھ ہمہ وقت تعامل کرتی رہے، تاکہ اسے اپنی وجودی معنویت، نصب العین، مقاصد، مطالب اور مزاحم قوتوں کا گہرے سے گہرا ادراک حاصل ہوتا چلا جائے، جس کی عدم موجودگی میں یہ کمزور اور بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہے۔ خودی اور ثقافت کا اقبال کے فکر کے تناظر میں باہم انتہائی گہرا تعلق اور رشتہ ہے۔ یہ ربط و تعلق دو سطحوں پر نظر آتا ہے۔ اول؛ خودی کی ذاتی و نفسی طاقت کے اظہار میں اور دوم؛ ماحول اور ثقافت کے مسلسل دباؤ اور چیلنج میں جو 'خودی' کو اپنے وجود کے تحفظ اور بامقصد تاریخی وجود بنانے پر آمادہ اور بر سرِ عمل رکھتا ہے۔ پہلے نکتے پر اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے اقبال کے نزدیک 'خودی' "نظامِ عالم کی اصل ہے۔ اور افراد کی زندگی و بقاء خودی کے استحکام پر موقوف ہے"۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

نقطہ ء نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاک ما شرارِ زندگی است

نقطہ ء نور، جسے اقبال 'خودی' کے لفظ سے وجود معنوی عطا کرتے ہیں۔ اس کی نفسی۔ وجودی اور کونی ساخت کے بارے میں درج ذیل اہم نکات بیان کرتے ہیں:

الف۔ "خودی کا اظہار اس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیاتِ نفسی کی وحدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ (ب) ہمارے داخلی محسوسات و مدرکات کا مطلب ہی یہ ہے کہ خودی کا عمل فعل جاری ہے۔ جب ہم کسی شے کا ادراک کرتے، یا اس پر حکم لگاتے، یا کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں خودی ہی سے آشنا ہوتے ہیں (ج) میں شے نہیں، عمل ہوں۔ (د) خودی کے اعمال و افعال میں ہدایت اور بامقصد ضبط و تصرف کے دوگونہ عناصر کار فرما ہیں تو یہ ماننے میں کوئی تامل نہیں رہتا کہ وہ خود بھی ایک آزاد علیت ہے۔ (ر) گویا کائنات کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق مادی جواہر کی میکانیاتی حرکت سے ہو یا ذاتِ انسانی میں فکر کی آزادانہ کار فرمائی سے، سب کی حقیقت بجز ایک عظیم اور برتر انا کے انکشافِ ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا قدرتِ الٰہیہ کا ہر جوہر خواہ اس کا درجہ ہستی پست ہو یا بلند، اپنی ماہیت میں ایک 'انا' ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس انیت یا خودی کے اظہار کا بھی اپنا اپنا ایک درجہ ہے۔ بڑا اور چھوٹا۔ بایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے۔ اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو اسی لیے حقیقتِ مطلقہ (اللہ تعالیٰ) کو انسان

کی رگ جان سے قریب تر ٹھہرایا (نحن اقرب من حبل الورید) 'کیونکہ یہ حیات الہیہ ہی کا سیل رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوئے اور زندگی بسر کرتے ہیں ۔ (۵) لہٰذا زمان حقیقی (انائے مطلق یا خدائے باری تعالیٰ) کی زندگی زمان متسلسل (انسانی خودی اور کمتر خودیوں کی مختلف اشکال) کی زنجیروں سے آزادی 'اور اس کے لیے لحہ بہ لحہ خلاق (کل یوم ھو فی شان)' زندگی ہے ۔ اس کا ہر عمل سرتا سر کامل آزادی اور ابداع کا عمل ہے ۔ اور اس لیے تخلیق کا فعل بھی آزادی کا فعل ہے 'کیونکہ تخلیق تکرار کی ضد ہے اور تکرار خاصہ ہے میکانیاتی طریق کار کا ۸ ان بیانات سے ہم واضح طور دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت علامہ اقبال نے خودی کے تصور کی جو نفسی ۔ وجودی ۔ کونی ساخت بیان کی ہے 'اس سے خودی کے بارے میں ہمارا مجموعی فکری تاثر کچھ یوں بنتا ہے کہ یہ (خودی) ایک مدارجی روحانی حقیقت (خدائے تعالیٰ کی مشیت) کا ظل ہے ۔ جس کا ساختیاتی اظہار زمان و مکان اور ورائے زمان و مکان ' متعدد بہ عوالم' جیسے طبیعی' حیاتی و نفسی' آفاقی' اور تاریخی و ثقافتی ' میں ہوتا ہے ۔ جس کی بناء پر میکانکی' حیوانی اور انسانی وجود کی تکمیل اور منتہائے مقصود کا حصول ممکن ہوتا ہے ۔ اس کی تمام مدارجی حالتیں اور کثرتیں' جس کا مغز' خودی انسانی ہے' جو اشرف المخلوقات ہے ; چنانچہ اس لحاظ سے خودی مطلق (اللہ تعالیٰ یا انائے بصیر) کا مکمل ترین اظہار' مزید برآں اس مکمل ترین اظہار کی دو ترقی یافتہ خودیاں ; شعور ولایت اور شعور نبوت; جن کے جذب و ذوق سے پیدا شدہ کائنات حیات و ثقافت اور ان کے کھینچے ہوئے خطوط مستقیم' وجود کائنات اور انسانی تاریخ کی معنویت کی صحیح نہج اور مقصد متعین کرتے ہیں ۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کا تصور خودی اپنی ظاہری و معنوی دونوں صورتوں میں اسلام کے ابدی اور سرمدی شعور' عقیدہ توحید سے جڑا ہوا ہے ۔ اور اسی معدن (resource) سے لامتناہی توانائی اور راہنمائی پاتا ہے ۔ توحید کی اسی لامتناہی شعوری قوت کا اظہار علامہ اقبال نے اس طرح کیا ہے :

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینہ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست '

بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تصور توحید نہ صرف خودی کو وجود و شہود کی مختلف جہتوں اور ابعاد میں عملی اور ٹھوس میدان عمل مہیا کرتا ہے بلکہ 'خودی' کی انفسی حقیقت کو بامعنی آفاقی' تاریخی اور ثقافتی حقیقت بنانے کے لیے ' ماحول اور فطرت کی مزاحم و موزوں قوتوں کو مفید طرز پر زیر استعمال لانے کے لیے' بامعنی عمل و خارجی محرک وسائل بھی مہیا کرتا ہے ۔ توحید' شعور انسانی

کو ورائے زمان و مکان کیفیات سے بہرہ مند بھی کرتی ہے ' جس میں وہ ایک طرف 'انا الحق' یا پھر 'سبحانی ما اعظما شانی' جیسے نفسی سکرات کا مصدر ظہور بن جاتا ہے تو دوسری طرف طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے اصحاب کی تاریخی جدو جہد کا زمانی و مکانی اظہار ; جس میں روح توحید' تاریخ و ثقافت کی ساختی ماہیت میں تخلیقی رد و بدل اور اضافہ کرتی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ روح توحید ' اسلامی ثقافت کے تاریخی پھیلاو کے لیے نئے نئے جہاں مہیا کرتی ہے تو بجا نہ ہوگا ۔ چنانچہ یہاں طارق بن زیاد کے جبل طارق پر ادا کئے گئے تاریخی فقرے ہمارے صدر شعور میں نئے در وا کریں گے ۔ اس نے اپنے لشکریوں اور مجاہدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ایھا الناس این المفر' البحر من ورائکم' والعدوا مامکم ولیس لکم والله الا الصدق والصبر (ترجمہ :لوگو! راہ فرار کوئی نہیں ' سمندر تمہارے پیچھے اور دشمن تمہارے سامنے ہے' اب خدا کی قسم صبر و ثبات اور سچے مجاہدانہ ذوق و شوق کے سوا تمہارا کوئی ساتھی نہیں) "

توحیدی فکر کے اسی تاریخی و عملی اثرات سے حضرت علامہ بیحد متاثر تھے' چنانچہ اپنے تصور خودی کو جو ایک انفسی شعوری ساخت ہے ' بطور ایک مخفی یا باطنی یا پراسرار شے کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ اس کی نفسی' وجودی ' کونی ساخت کے مختلف النوع انکشافات کے لیے مختلف مراتب شہادت اور پرکھ مقرر کرتے ہیں ' وہ اسے شے یا تصور نہیں قرار دیتے بلکہ "عمل" اور "اطناب کی حالت قرار دیتے ہیں"' جو اپنی کنہ کے اعتبار سے نفس انسانی کی وحدت سے نموپاتی ہے ' جس کی حرکی شعوری حقیقت کا اظہار' حیاتی' طبیعی' تاریخی اور ثقافتی عوالم میں اس کے تخلیقی عمل سے ہوتا ہے ۔ چنانچہ خودی اپنی زمانی و مکانی ساخت کے اعتبار سے اپنے مدارجی اور طبقاتی وجود کا مظہر فرد کامل کو بناتے ہوئے ' اپنی تخلیقی توانائی اور مقصد حیات کا اظہار کرتی ہے ۔ مگر یہ اظہار فرد کامل یا بالعموم انسان کے نظریہ حیات سے نمو خیز ہوتا ہے ۔ چنانچہ خودی نہ صرف انفسی شعوری حقیقت کے طور پر انسان کی زندگی پر محیط ہے بلکہ مختلف انسانی اعمال کی تخلیق; جیسے تاریخ کا اتار چڑھاو فن تعمیر کے نادر نمونے ' اعلی شاعری کے شہ پارے ' ثقافت کے عمومی اور خصوصی نتائج ' شعوری و روحانی واردات کے جان گداز نظارے : غرض تہذیب انسانی کے ہر مدارج اور ہر پہلو میں' خودی کا تخلیقی ارادہ' اس کا ذوق نمو' اس کا جوہر آرزو' اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمیں تجسس اور مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے ۔ اس لیے حضرت علامہ نسل انسانی کی لابدی وحدت کی شعوری حقیقت' جس کو خودی ' اپنے اعماق وجود میں محسوس کرتی ہے اور آفاق (تاریخ' فطرت اور ثقافت) میں ادراک کرتی ہے اور بار بار کرتی ہے ' جس کا خالق ' خدائے بزرگ و برتر جل جلالہ ' خودی مطلق انائے بصیر' خالق کل ہے ; اس کے انسانی ثقافت کے ساتھ رشتے اور عملی اثرات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ " نوع انسانی ایک ہے ' اس لیے کہ وہ محیط برکل ذات جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے ' جوہر 'انا' (خودی) کی خالق اور اس کا سہارا ہے' ایک ہے لہٰذا قرآن مجید نے نسل اور قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم کو تعارف کا ایک ذریعہ ٹھہرایا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے ۔ حاصل کلام یہ کہ اسلام میں صلوۃ باجماعت

حصول معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں ' اس کی قدر و قیمت کچھ اس سے بڑھ کر ہے ۔ صلوۃ باجماعت سے اس تمنا کا اظہار بھی مقصود ہے کہ ہم ان سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے جو انسان اور انسان کے درمیان قائم ہیں ' اپنی اس وحدت کی ترجمانی جو گویا ہماری خلقت میں داخل ہے ' اس طرح کریں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا اظہار سچ مچ ایک حقیقت کے طور پر ہونے لگے"۔ توحید بطور نظریہ حیات کے 'خودی' کی انفسی ۔ شعوری واردات کے زائداز زمان و مکان حقائق کے اکتشاف کے اصول محرک کے ساتھ ساتھ آفاقی مدرکات کے زمانی ۔ مکانی' ساختیاتی اظہار ; جو انسانی تاریخ و ثقافت آثاریات فن تعمیر' اشیائے استعمال و ضرورت اور طبیعی حقیقت کے وجود میں بھی عیاں ہے' عمل پذیر نظر آتی ہے ۔ مرد مسلم (انسان) کی , خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے ' بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے ۔ پھر یہ درحقیقت اس کے کچھ بن سکنے ہی کی کوشش ہے ' جس میں بالاخر اسے موقع ملتا ہے کہ اپنی معروضیت (ثقافتی حقیقت واہمیت) کا زیادہ گہرا ادراک پیدا کرتے ہوئے زیادہ عمیق اور مستحکم بناء پر 'انا الموجود' کہہ سکے ' یعنی وہ اپنے وجود کی کنہ اور اساس کو پالے ---------- خودی کا منتہاے جستجو یہ نہیں کہ اپنی انفرادیت کی حدود توڑ ڈالے ' بلکہ اسکا منتہا ہے اپنی انفرادیت کو زیادہ صحت کے ساتھ سمجھ لینا ----- لہٰذا اس کا آخری عمل فکر کا عمل نہیں (یعنی فکری و علمی و نظری حقیقت نہیں) ۔ وہ ایک حیاتی عمل ہے جو اس میں گہرائی اور پختگی پیدا کرتا اور اس کے ارادوں کو تقویت دیتے ہوئے ایک شان خلاقی کے ساتھ اس تیقن کا باعث ہوتا ہے کہ دنیا (ثقافت کی حیات) محض دیکھنے یا افکار و تصورات کی شکل میں سمجھنے کی چیز نہیں' بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنے مسلسل عمل سے بار بار بناتے اور بنا کر پھر بناتے رہتے ہیں""۔ 'خودی' کی شان خلاقی بنت اور بار بار 'بنت' کا عمل ہے ۔ اس 'شان خلاقی' کا شعور' تخلیق کا عمل اور اس کا اظہار' اس کی قبولیت عدم قبولیت کا معیار' اجتماعی ثقافت ہی فرد میں پیدا کرتی ہے ۔ وہ تمام عوامل' محرکات' ذرائع ' مقاصد اور طریقہ ہائے کار' جن سے فرد کی خودی مستقیم ،مستحکم' خلاق' طاقتور اور بامراد ہوتی ہے' وہ سارے کے سارے ثقافت کے پیدا کردہ ہیں' مثلاً" نظام تعلیم' عوامی اخلاقیات کی حدود' فطرت و ماحول کے بارے میں رجحان' سماجی تعلقات کے معیار' نیک و بد کا شعور' مقصد حیات سے آگہی اور فراغت و معروضیت کے اوقات وغیرہ سب کے اصول و قواعد اور شعوری نظام' ثقافت کے ساتھ ہی پیوستہ ہیں ۔ تاہم ' خودی کی طرح ثقافت بھی نظریہ حیات (توحید) سے پیوست ہو کر ہی ایک بامعنی تاریخی و معاشرتی و آثاری حقیقت بنتی ہے ۔ یہ نظریہ حیات کے ساتھ مکمل شناخت و پیوستہ ہونے کی ضرورت کا احساس ہی ہے ' جس کو قرآن حکیم ' اس آیہ مبارکہ کے ذریعے پیدا کرنا چاہتا ہے "قل سیروا فی الارض و کیف کان عاقبتہ للمتقین ہ" (قرآن مجید) ' تاکہ فرد کی خودی' خودی مطلق تک رسائی کے لیے ' ان تاریخی' آثاری اور ثقافتی حقائق کو سیڑھی بنائے ' نہ بذاتہ مطلوب و مقصود جستجو یا پھر وجود باری تعالی کے اقرار و انکار کے لیے ایک نا تمام دلیل کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دے ' جس سے سوائے مادیت' دھریت اور گمراہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ' یہی وجہ ہے اقبال انفرادی خودی کی

پرداخت و نمو کے لیے موزوں ملی ' تاریخی اور ثقافتی ماحول کا تجزیہ "رموز بیخودی" (۱۹۱۸ء) میں بالتفصیل پیش کرتے ہیں ۔ جو انفرادی خودی کو بامعنی تاریخی و ثقافتی وجود میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ توحیدی نظریہ حیات ہمیں نہ صرف خودی کی معنویت کا ادراک و احساس عطا کرتا ہے بلکہ یہ ان اجتماعی اصول و ضوابط اور اعمال و افعال کا تعین بھی کرتا ہے جن کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے خودی ایک جاندار حقیقت بنتی ہے ۔ مسلم ثقافت کی تاریخی انفرادیت کے بارے میں اقبال بہت واضح اور صاف گو ہیں' ان کے خیال میں "مسلمانوں اور دنیا کی دیگر قوموں میں جو ناگزیر فرق ہے اس کی وجہ ہمارا قومیت کا مخصوص تصور ہے (جو ظاہر ہے توحیدی نظریہ حیات سے پیدا ہوتا ہے) ۔ ہمارے تصور قومیت کے اصول اشتراک زبان یا اشتراک وطن یا مشترکہ معاشی مفادات کی اساس پر استوار نہیں ہیں ۔ ایسا اس لیے کہ کائنات سے متعلق ہمارا عقیدہ ایک ہے ' ہم سب مشترکہ تاریخی روایات کے امین ہیں اور پھر یہ کہ ہم اس معاشرے کے رکن ہیں جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمایا تھا" [۳] اسی خطبے میں آگے چل کر وہ دوٹوک انداز میں یہ فرماتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کو یکساں نظریہ حیات (توحید و رسالت) سے پیوست کرنا کتنا اہم ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "ملت اسلامیہ کا ایک فعال رکن بننے کے لیے فرد کو مذہبی اصولوں (ایمانیات) پر غیر مشروط ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسلامی تمدن (معاملات' معاشرت' اصول و ضوابط) میں بھی رچ بس جانا چاہیے ۔ اس رچ بس جانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک یک رنگ ذہنی ہم آہنگی تخلیق کی جائے ۔ (یعنی) دنیا کو دیکھنے کا ایک مخصوص طریقہ (توحیدی نظریہ حیات) اختیار کیا جائے ' ایک حتمی موقف اپنایا جائے جس کے ذریعے اشیاء کی قدر و قیمت کو جانچا جا سکے (اسلامی سیاسی و اخلاقی فلسفہ کی تشکیل) ۔ ایک ایسا موقف جو ہماری جماعت (ثقافت) کی وضاحت کرے ۔ اسے اجتماعی وحدت میں تبدیل کرے اسے ایک حتمی مقصد اور اپنی ماہیت کا ادراک کرے " (اسلامی علم ثقافت و عمرانیات کی تدوین) [۴] چنانچہ پروفیسر عثمان ' اقبال کے اسی ثقافتی نقطہ نظر کے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں کہ :

> " فرد کی تکمیل یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن و قلب کی تمام صلاحیتوں کو ترقی دے کر ان کو اجتماعی خیر و بہبود کے لیے وقف کر دے ۔ (یعنی ملی ثقافت کی ترقی میں ممد و معاون ہو)' اور اس طرح اپنی تربیت یافتہ انفرادیت کو جماعت (معاشرے ۔ تمدن) کے فروغ و استحکام کا باعث بنائے ۔ جو فرد ایسا نہیں کرتا ' جو اجتماعی مفاد (ثقافتی عزائم ارادے اور مقاصد) کو پس پشت ڈالتا یا اس سے قطع نظر کرتا ہے ۔ اس کی خودی ناقص ' نامکمل اور نامراد رہتی ہے " [۵]

حضرت علامہ ' فرد اور اس کے ملی ثقافتی وجود کے ساتھ اس کے نامی رشتے پر یوں گویا ہوتے ہیں :

فرد ی گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد ی یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود

قطرہ ء وسعت طلب قلزم شود "

جس طرح، فرد کی خودی ایک انفسی شعوری حقیقت کے طور پر انائے مطلق، احدیت باری تعالی سے مستنیر ہو کر، تخیل و تخلیق کے نئے نئے زاویے پیدا کرتی ہے، اسی طرح، خودی کی عملی معنویت و اہمیت، اس کا ماحول اور ثقافت ہی متعین کرتی ہے۔ اور خودی کی تخلیقی طاقت کی جانچ کا معیار بھی۔ کیونکہ خودی کی طرز پر ثقافت بھی ایک آفاقی۔ تاریخی حقیقت ہے، جس میں انفرادی افعال و اعمال کا ریکارڈ مسلسل مرتب ہوتا رہتا ہے، در حقیقت یہ آفاقی۔ تاریخی حقیقت، توحیدی نظریہ حیات کی بدولت، مشیت وارادہ انائے مطلق، خدائے بزرگ و برتر سے ہی مستنیر اور تحریک پاتی ہے۔ اس طرح ہر فرد کی خودی اور اجتماعی خودی (ثقافت) کا نقطہ ماسکہ، توحیدی نظریہ حیات ہی ہے۔ نبوت و رسالت اقبال کے نزدیک توحیدی نظریہ حیات کا سب سے طاقتور ترین اور مکمل ترین اظہار ہے۔ جس نے دوسرے آفاقی۔ تاریخی اور شعوری حقائق (ہماری مراد مختلف النوع کی لادینی، نیم مہذب نیم وحشی انسانی ثقافتیں ہیں)، جو بزعم خویش اپنی عقل و حواس یا موہوم عقیدے کے بل بوتے پر فرد اور معاشرے کی حیات کی قدر و نقد کا معیار متعین کرنے کا دعوی کرتے ہیں، کے بالمقابل، وہ حتمی الوہی۔ روحانی معیار قدر و نقد مہیا کر دیا ہے، جس نے صاف اور واضح طور پر عقل و حواس کو الہی حدود کے اندر رہتے ہوئے تلاش حقیقت و حق کا انداز بخشا ہے۔ ثقافت انسانی کے وہ سارے زریں و ظیفے، شعور نبوت ہی سے پھوٹے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو بالخصوص اور تمام عالم انسانی بلکہ اگر کہا جائے متعدد بہ عوالم کو وہ اصول و ضوابط عطا کئے ہیں، جن پر عمل پیرا ہو کر مساوات، حریت، عدل، علم، اخلاق اور اخوت کے صحیح مفاہیم و مطالب نسل آدم کی تقدیر کا حصہ بن سکتے ہیں۔ نبوت کا وجود اور اس کی پیدا کردہ ثقافت؛ وجود باری تعالی کا نہ صرف انفسی و جودی بلکہ ہمیشہ کے لیے آفاقی۔ تاریخی اثبات ہے۔ جس کو پوری عقلی و فکری طاقت صرف کرنے کے باوجود مغرب اور مغرب زدہ فلاسفہ نظر انداز نہیں کر پا رہے بلکہ اب تو "کلیسا مغرب" کے اندر خود زمزمہ ہائے توحید اور غلغلہ ہائے لا الہ دوبارہ گونجنے لگے ہیں، نغمہ حجاز پھر سے یورپ کی سرزمین میں سنا جانے لگا ہے، چنانچہ "پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" کی سچائی ایک نئے انداز سے ہمارے سامنے آ رہی ہے، خیر یہ امر الگ سے تحقیق کا متقاضی ہے۔ در آنحالیکہ نبوت و رسالت نے ایک عالمگیر ثقافت کی بھی تشکیل کی ہے۔ اس نے طہارت و نجاست، میل ملاپ، نکاح و امومت، رسم و قانون، وضع قطع، رویہ و مکالمہ، محبت و طرز رزق کے انداز، تصور حیات و ممات اور حقیقت الحقائق کا ادراک و لقا کا اشتیاق بھی نوع انسانی کو عطا کیا ہے۔ اس نے انسان قدیم اور انسان آئندہ کو، دقیانوسیت، جہالت، تعصب اور طبقات سے نجات دلا کر حقیقی حریت و آزادی کا گر سکھلایا ہے۔ عقل و حواس کو خود بینی سے نکال کر جہاں بینی اور خدا شناسی کا جذبہ منتقل کیا ہے۔ چنانچہ

ثقافت نبوت و رسالت کی اہمیت اور مسلم ثقافت کے لیے اس کی خصوصی نوعیت کے بارے میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں :

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما ' آئین ما [۱۷]

یہ ثقافت کوئی سراب یا تخیل نہیں بلکہ ایک ٹھوس آفاقی ۔ تاریخی شعوری حقیقت ہے' جس نے کبھی بدر و حنین میں 'کبھی کربلا میں' کبھی اندلس میں' اپنے یقین ' مقاصد اور عمل کا مظاہرہ کیا ہے ۔ جو تاریخی حقیقت اس ثقافت سے جنم لیتی ہے' اور جس مزاحم ثقافت سے اس کو معاملہ در پیش ہے' اس کو حضرت علامہ نے یوں بیان کیا ہے:

موسی و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آید پدید [۱۸]

فرعون و یزید اور فی زمانہ ان کے جانشین ہٹلر اور سٹالن جس ثقافت کے نمائندے ہیں وہ کیا ہے ؟ وہ ہے ایک متکبر' مادہ پرست' انسان دشمن' بے معنی اور بے مقصد تاریخی وجود جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں یکساں ہیں ۔ کیونکہ اس سے انسانی فلاح و اخوت و محبت کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں ۔ فکر و ادب میں نطشے کی نہلیت (Nihilism) ' سارتر کی دہریت ۔ مادیت اور البرٹ کامیوکی ' بے معنویت' سب باہم ملکر' مغربی ثقافت کا جو انسان ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے' وہ فرانز کافکا کی (Metamorphisis) کے ہیرو کی طرح تنہا تنہا' یاس و حزن و خوف گرفتہ' بگڑا ہوا انسان یا پھر اعلی سطحی حیوان' جو کوٹ پتلون پہنے ' نکٹائی لگائے' دو ٹانگوں پر چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے ۔ یہ "مادیت پرست حسیت پسند ۔ خورد و نوش زدہ " ثقافت ' انسان کی کیا راہنمائی کرے گی ۔ یہ تو خود اندھے غار کے دھانے پر کھڑی ہے ۔ چہ جائیکہ یہ اس ثقافت کو سرنگوں کرنے یا مٹانے میں کامیاب ہو جائے ' جس کی بناء لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے ، اور جس کی بنیاد اور عمارت دونوں شہیدوں کے لہو سے سرخ ہیں ؟ بایں ہمہ نبوت و رسالت کا تاریخی ۔ آفاقی شعور ہی فرد کی صحیح نجات و حریت کا ضامن ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا توحیدی نظریہ حیات' فی زمانہ ' خودی (علم نفس) اور ثقافت (عمرانی علوم) کے لیے قابل قدر علمی و تجزیاتی خطوط مہیا کر سکتا ہے یا نہیں ؟ ہمارا جواب ہاں میں ہے اور اس کے اثبات کے لیے ہم سراج الحسین کے مقالے سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں' جس میں توحیدی علمی اکائی یا اسلامی سائنس کی موزونیت کی علمی بنیادوں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" Epistemologically speaking it follows from the unified cognitive field theory that the syntatic intensity of a cognitive event horizon may telelogically grow to its ontological fullfillment ----- a tawhidi episteme or islamic science - signifying a uniquely moaotheistic Creator. The Tawhidi episteme so defined is unique by virtue of the fact that it proceeds in a nan-Euclidean space as Riemannian (or Rahmanian) tensor independent of inertial frame of reference of immediate sense experience, Whether dogmatic or anthropomorphic, to define the concept of Creator. In the absence of a non-Euclidean approach to this concept the human mind is prone to degenerate into Euclidiean space, which is typically manifested by a variety of pantheistic as well as poly theistic models of god."[9]

یوں دیکھا جائے تو توحیدی نقطہ نظر صرف اور صرف مابعدالطبیعیاتی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا بلکہ ایک شعوری وحدت کے طور پر مختلف النوع انسانی و طبیعی علوم و فنون کے حصول ' تدوین اور تعبیر کے لیے علمی بنیاد بھی بن جاتا ہے ۔ بشرطیکہ ہم 'توحیدی' تصور کو غیر اقلیدسی زمان و مکان کے تناظر میں دیکھیں ۔ اس طریقے پر انسانی خودی کے وجود میں جو 'Cognitive shift' (شعوری تبادلہ) ہوتا ہے ' وہ حیات 'کائنات اور ثقافت کے بارے میں اس کے مادیت پرستانہ ۔ زمین پیوستہ ۔ حسیت پسند رویے کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے ۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے بھی مکتوبات میں ذات واجب الوجود یا توحید باری تعالی کو ایک "بیچون بیچگون" ادراک قرار دیا ہے ۔ جس کو قرآن حکیم " لا یدرک الابصار " کی معنی خیز آیہ مبارکہ میں بیان کرتا ہے ۔ جب انسان' مرد کامل' اس بیچونی ۔ بیچگونی کے ساتھ کیفیت پیدا کر لیتا ہے' تو پھر اس کے وجود کے اندر انفسی حقیقت کا حامہ یعنی بیداری خودی اور اس خودی کا آفاقی ۔ تاریخی اظہار و انکشاف' شہود کرتا ہے' توحیدی نظریہ حیات' جو شعوری تبادلہ' انفرادی خودیوں کی شعوری حرکیات میں پیدا کرتا ہے' اس کے نتیجے میں محسوس و متناہی کو' مجرد و لامتناہی کی واردات سے وجودی ۔ کونی سطح پر منسلک کر دیتا ہے ۔ بایں ہمہ ذہن و عمل کے لیے تخیل و حیات کے نئے نئے گوشے وا کر دیتا ہے ۔ تمدن و ثقافت میں جو عظیم الشان تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ' یا پھر عبقری تخلیقات کے اکتشافات' یہ سبھی کچھ' اسی لمحے آفاقی ۔ تاریخی حقیقت کا روپ دھارتے ہیں' جب افراد کی خودی مذکورہ شعوری تبادلہ' سے لذت آشنا ہوتی ہے ' یعنی توحیدی فکر سے پیوستہ ہو جاتی ہے ۔ خودی' فرد کی سطح پر اور ثقافت اجتماعی سطح پر ماہیت شعور میں بنیادی تبدیلی یا 'Cognitive shift' کی بدولت ہی بامعنی کلیت واردت وجودی کا حصہ بنتی اور تاریخ و ماحول کے کٹھن مہیجات کا قابل عمل جواب متعین کرتی ہیں ۔ اس باہمی انتقالی رشتہ جو توحیدی فکر ' خودی اور ثقافت کے باہمی وجود' میں قائم کرتی ہے کے بارے میں حضرت علامہ یوں گویا ہوئے ہیں :

ہر کہ آب از زمزم ملت نخورد
شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد
فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است [۲۰]

چنانچہ اسی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عثمان لکھتے ہیں :

" افراد (اور ان کی خودی) کے اندر اعلیٰ مقاصد (تخلیقی افکار و جستجو مثل شاعری' ادبیات ' علوم ' آلات سازی وغیرہ) کی لگن قوم ہی کے اجتماعی نظام (مثل ثقافت و تاریخ و علامات) اور اس کے الجھے ہوئے مسائل کی بدولت پیدا ہوتی ہے ۔ قوم کے حالات (ثقافتی مسائل) ہی ہمارے اندر ہیجان مچاکرتے اور ہماری قوتوں کو للکارتے ' پکارتے اور بیدار کرتے ہیں ۔ اس لحاظ سے جماعت کا وجود (مشترک ثقافت) افراد کی (اور ان کی خودی) کے لیے تعلیمی ناگزیر ہے ۔ یہی سبب ہے کہ جو لوگ ملت (اس کی ثقافت و تاریخ) سے غفلت یا بے تعلقی برتتے ہیں ' ان کی صلاحیتوں کا شعلہ جلد سرد پڑجاتا ہے ' اور ان کی قوتوں کا شیرازہ بکھرتے دیر نہیں لگتی " [۲۱]

تاہم اگر خودی کا جوہر :

" اپنی ذات کی خلوت گاہ سے نکل کر ہنگامہ عالم (تاریخ و ثقافت کی واردات) میں شریک ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بھول جاتا ہے ۔ اس کے دل میں 'من' کی بجائے 'او' اور تو کا نقش گھر کر لیتا ہے ۔ یعنی وہ اپنے مفاد کی بجائے دوسروں کے مفاد اور بہبود (شہادت' جہاد اور ایجادات) کی فکر کرتا ہے اور انتہائی ایثار سے کام لیتا ہے ۔ وہ اپنی آسائش (ذاتی پسند ناپسند) اور آزادی (ارادہ و حکم) کو بہ صد خوشی قوم کی فلاح پر قربان کر دیتا ہے ۔ یہی اصل بیخودی ہے ، (یہی ثقافت اور تمدن کی روح ہے) اس ایثار اور بے نفسی کی بدولت خودی برگ گل سے گزار بنتی ہے ۔ [۲۲]

چنانچہ اقبال فرماتے ہیں :

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے' چمن گردد خودی [۲۳]

اسی بناء پر اقبال نے "اس بات پر زور دیا ہے کہ توحید (نظریہ وحدت) ہماری قومیت (ثقافت) کی جان ہے' ملت اسلامیہ ایک جسم (وحدت ذہنی و فکری) کی مانند ہے ۔ اور توحید (نظریہ حیات) اس کی روح رواں ہے ۔ یہی رشتہ ہمارے افکار و اعمال کا شیرازہ بند ہے ۔ اس کی بدولت بلال حبشی اور ابوذر غفاری آپس میں بھائی ہیں ۔ (انما المومنون اخوہ) دنیا کی باقی قومیں (ثقافتیں) نسب ' وطن اور نہ جانے کس کس بات پر فخر کرتی ہیں ۔ مگر ہمارے لیے کوئی شئے باعث افتخار نہیں (ماسوائے تقویٰ کے) کیونکہ ہمارے دلوں میں توحید (اور اس سے اخذ شدہ علم و مشاہدات) کا نقش گہرا ہے ۔ ہماری ملت (اور اس کی ثقافت) کی اساس چونکہ خدا کے ایک

ہونے کے عقیدہ پر ہے لہٰذا اس کی بدولت اور اس کی برکت سے ہم بھی ایک ہیں' ہماری زبان ' ہمارے دل اور ہماری جان ایک ہے" ۲۴ ۔ تاہم ' توحیدی نظریہ حیات جس طرح 'خودی' کو 'راز درون حیات' بنا دیتا ہے' ایک مسلسل منہج اور تگ و تاز سے مرکب شعوری حقیقت ; بالکل اسی طرح یہ ثقافت کو زمزم ملت' 'چمن گردد' ایک مسلسل تاریخی اور ماحولیاتی قوت بنا دیتا ہے ۔ یوں توحیدی نظریہ حیات نہ صرف نفسی و علمی سطح پر شعور افراد کو متحیل بناتا اور تخلیقی نمو دیتا ہے' بلکہ اجتماعی اور تاریخی سطح پر' ان پائیدار اخلاقی ' روحانی اور اعلیٰ ترین ملی ثقافتی اقدار کی بنیادیں بھی مہیا کرتا ہے ' جو فرد کی خودی اور ثقافت کی مجموعی طاقت کو مفید باہمی تعامل' جاندار ربط و اثر و نفوذ اور زندہ شعوری تبادلے و مکالمے میں مصروف رکھتا ہے ۔ ہمارے خیال میں فرد کی خودی اور ثقافت کی ساخت اسی وقت بامعنی حقائق اور عملی نتائج پیدا کرتے ہیں ' جب وہ انفسی اور آفاقی دونوں (Coordinates) میں توحیدی نظریہ حیات سے وابستہ اور پیوستہ ہوں ۔ با ایں ہمہ اقبال اس اہم فکری نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں' "تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد موجود ہے ۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے ۔ بعینہ جہاں تک بطور ایک نظام اجتماع (ثقافت) جذبات سے کام لینے کا تعلق ہے ۔ اس نے رنگ اور خون کے رشتے ٹھکرا دیئے اور اپنی توجہ صرف فرد کی ذاتی قدر و قیمت پر رکھی (ان عند اللہ اتقکم)' رنگ و خون کا رشتہ زمین پیوستگی کا رشتہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد انسانی کے لیے کسی نفسیاتی اساس کی جستجو جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے ' جب اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ نوع انسانی ایک ہے اور اس کی زندگی کا مبداء اصلا" "روحانی" ہے ۲۵ ۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ محولہ بالا پیراگراف میں اقبال کتنی دور بینی اور تاریخی شعوریت کے ساتھ ہر اس "ازم" کے خاتمے اور موت کا اعلان کر رہے ہیں جو وحدت انسانی کی اساس ' روحانی ۔ نفسیاتی اصول (توحیدی نظریہ حیات) کے علاوہ کسی معاشی' طبقاتی یا نسلی اشتراک اصول پر رکھتے ہیں ۔ اشتراکیت کے خاتمے پر خود اشتراکیوں نے مہر فناء ثبت کر دی ہے ۔ مگر ہمارے ہاں اب بھی معدودے چند روشن خیال حضرات بزعم خویش اس سوچ کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں لگے ہیں ۔ کامیابی نہ پہلے ہوئی نہ آئندہ ہونے کی امید نظر آتی ہے ۔ وجہ ! تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے جو دراصل شعور انسانی کی باطنی و اخلاقی طاقت کی جیت کا ثبوت ہے ۔ دوسری طرف سرمایہ دار امریکہ اور مغربی حواری ' اگرچہ " لبرل ڈیما کریسی " کا ڈھونگ رچا کر عالم اسلامی کا مسلسل کشت ' خون کئے جا رہے ہیں اور فوکویاما(۱۹۹۱ء) کا مضمون 'The End of History' جن کی نئی بائبل بن چکا ہے ' نئے معاشی مفادات کی وحدت کی بناء پر بالخصوص عالم اسلام کے توحیدی نظریہ حیات سے خوفزدہ ہیں ۔ چنانچہ وہ اپنے پیروؤں کو بار بار یہ باور کرانے میں لگے رہتے ہیں کہ " مذہبی رجعت پسندی " اب کبھی تاریخ و تمدن کی اہم اور فیصلہ طاقت نہیں بن سکے گی ۔ بلکہ یہ گلوبلزم اور لبرل ازم کا عہد ہے ۔ اور اس کی حتمی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہے ۔ اگر آخری کامیابی اتنی آسان اور سہل

الحصول ہوتی تو اسلام کے مختلف علاقوں میں نئی جستجو اور جد و جہد کبھی اتنی تیزی اختیار نہ کرتی ' جتنی وہ کر چکی ہے ۔ خود مغرب میں اسلامی اقدار و ثقافت کی شناخت و بقاء کے لیے عملی جد و جہد شروع کی جا چکی ہے ۔ حالیہ دنوں میں فرانس میں اسلامی پردہ کے لیے مسلمان بچیوں کی ثابت قدمی سے دل و دماغ میں اک نیا اضطراب اور ایک نیا ولولہ دوڑنے لگتا ہے ۔ لہٰذا بے ساختہ حضرت علامہ کا وہ شعر دہرانے کو دل چاہتا ہے جو انہوں نے جنگ طرابلس کی شہید فاطمہ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا :

فاطمہ تو آبروے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے [۲۶]

فاطمہ آج پھر زندہ ہے ۔ مگر اس کی جد و جہد اب کی بار "کلیسا مغرب "میں نمودار ہوئی ہے ۔ اسلامی پردہ کی جد و جہد' فرانس اور مغرب کی لادینیت اور مادیت کو ان کے اپنے علاقے میں اسلامی اخلاقی و ثقافتی اقدار کا واضح اور کھلا چیلنج ہے ۔ مگر مغرب جواب نہ دے سکے گا کیونکہ وہ جواب دینے کا اہل ہی نہیں ۔ ایسے اقبال کی صدائے انا الموجود اپنی عملی و تاریخی شہادتیں' نئے ڈھنگ سے اکٹھی کر رہی ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر آ کر خودی ' ثقافت' تاریخ اور تخیل کائنات توحیدی نظریہ حیات کے آب حیوان سے جذبہ تازہ اور مقصد نو پاتے ہیں اور اسی میں گم ہو کر نئی حیات ' نئی ذات اور نئی ثقافت تشکیل دیتے ہیں ۔ جس کی سچائی کے لیے اقبال نے تین گواہیاں طلب کی ہیں ' آیئے ان کی زبان مبارک سے سنیں اور ایمان تازہ کریں :

زندہ ای یا مردہ ای یا جان بلب
از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہد اول شعور خویشتن
خویش را دیدن بنور خویشتن
شاہد ثانی شعور دیگرے
خویش را بینی بہ نورے دیگرے
شاہد ثالث شعور ذات حق
خویش را دیدن بنور ذات حق [۲۷]

حواشی

۱ ۔ منور' پروفیسر محمد' اقبال ریویو ۱۹۹۱ء ' ص ۶۵
۲ ۔ عثمان ' پروفیسر محمد ' اسرار و رموز پر ایک نظر' لاہور' ۱۹۷۷ء ' ص ۵

۳۔ ایضاً" ص ۶
۴۔ اقبال ' محمد ' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ترجمہ نذیر نیازی) بزم اقبال ۱۹۸۳ء ص ۱۴۸
۵۔ ایضاً" ص ۱۵۴
۶۔ اقبال ' محمد 'کلیات اقبال (اسرار خودی) ۱۹۱۵ء
۷۔ ایضاً"
۸۔ اقبال' علامہ محمد 'تشکیل جدید ' ص ۸'۷۷'۱۳۹'۱۵۴'۱۰۹
۹۔ اقبال ' علامہ محمد ' اسرار خودی ' ۱۹۱۵ء
۱۰۔ ندوی ' ابوالحسن ' نقوش اقبال' ادارہ نشریات اسلام لاہور' ۱۹۸۸ء ص ۲۱۱
۱۱۔ اقبال ' تشکیل جدید 'ص ۱۴۰
۱۲۔ ایضاً" ص ۳۰۷
۱۳۔ اقبال ' ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ۱۹۸۹ء ص ۲۲ ' ۲۱
۱۴۔ اقبال ' ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ۱۹۸۹ء ص ۳۱
۱۵۔ عثمان' پروفیسر محمد' اسرار و رموز پر ایک نظر' ۱۹۷۷ء ص ۱۱۷
۱۶۔ اقبال , علامہ محمد' رموز بیخودی ' ۱۹۱۸ء
۱۷۔ ایضاً"
۱۸۔ ایضاً"
۱۹۔ سراج الحسین 'Islamic Science : The making of a formal Intellectual Discipline. The Journal of American Islamic Social Sciences. No. 3 Vol: 36.1992.
۲۰۔ اقبال ' رموز بیخودی ۔ ۱۹۱۸ء
۲۱۔ عثمان' محمد ۔ اسرار و رموز پر ایک نظر' ص ۱۰۳
۲۲۔ ایضاً" ص ۱۰۶
۲۳۔ اقبال ' علامہ محمد ' رموز بیخودی ۔ ۱۹۱۸ء
۲۴۔ عثمان ' پروفیسر محمد ' اسرار و رموز پر ایک نظر' ص ۱۱۷
۲۵۔ اقبال ' علامہ محمد' تشکیل جدید ' ص ۲۲۳
۲۶۔ اقبال' علامہ محمد' بانگ درا ۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ ص ۲۳۹
۲۷۔ اقبال ' علامہ محمد' جاوید نامہ ' جنوری ۱۹۶۴ء ص ۱۳' ۱۴

یہ مقالہ پاکستان فلسفہ کانگریس کا منعقدہ اسلام آباد ' نومبر ۱۹۹۴ء میں پڑھا گیا ۔